اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کے افسانوں میں محیّر العقول عناصر: تقابلی مطالعہ

Mysterious Elements in the Fictions of Ashfaq Ahmad and Bano Qudsia: A Comparative Study

اسرار احمد[i] ڈاکٹر نسیمہ رحمان[ii]

Abstract:

The universe, with all its mysteries and complexities has always kept the man perplexed and astonished ever since he came into being. The mysteries which got resolved were termed as physical and natural laws. But despite an evolutionary journey spanning over millions of years, there are still innumerable phenomena in the universe that remain beyond any logical explanation. They are classified as metaphysics. How could any sensible and sensitive creator remain alien and unattracted to such supernatural elements? Ashfaq Ahmad and Bano Qudsia had an obsession for mysticism and they presented supernatural characters strongly and fittingly in his metaphysical Urdu short stories.

Keywords: *Ashfaq Ahmad, Bano Qudsia, Comparative Study, Urdu Short Stories, Metaphysics, Supernatural, Bewildering.*

انسان آفرینشِ وجود سے ہی کائنات کے تحیّر میں ڈوبا رہا۔ کائناتی اسرار و رموز جو اس کو ورطۂ حیرت میں مبتلا کیے رکھتے تھے جوں جوں تسخیر ہوتے گئے توں توں حضرتِ انسان طبیعیاتی جوابات پاتا گیا۔ مگر لاکھوں سال کے اس ارتقائی سفر میں اب بھی ایسے بے شمار تحیراتی رموز ہیں جن تک انسان کی رسائی ممکن نہ ہو پائی اور انھی حیرت کدوں کو جو ورائے فہم و ادراک ہیں انسانوں نے مابعد طبیعات، فوق الفطرت یا محیّر العقول کا نام دیا۔ ایک باشعور اور حساس تخلیق کار بھلا کس طرح ان ماورائی و محیّر العقول عناصر سے نابلد رہ سکتا ہے۔ اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کہ جن کی رگ وپے میں تحیّر اور تصوف سمایا ہوا ہے انھوں نے اپنے ما بعد الطبیعاتی، فوق الفطرت اور محیّر العقول عناصر والے کرداروں کو نہایت مضبوط اور احسن طریقے سے برتا ہے۔

کلیدی الفاظ: اشفاق احمد، بانو قدسیہ، تقابل، اردو افسانہ، محیّر العقول، مابعد الطبیعات، فوق الفطرت۔

ششدر و حیران رہ جانا انسانی سرشت کا خاصہ ہے۔ خاص طور پر اُس بات پر جو کہ اس کی کائنات کی معلوم حقیقتوں سے ماورا ہو۔ ایسے عناصر جب انسان کے سامنے آتے ہیں تو وہ اپنی آنکھوں پر یقین تو نہیں کرتا مگر ان عناصر سے محظوظ ضرور ہوتا ہے۔ اشفاق احمد اور بانو قدسیہ زندگی اور ادب کے ہم سفر رہے ہیں۔ ان دونوں کے ہاں ایسے افسانے پائے جاتے ہیں جن میں فوق الفطرت، مابعدالطبیعاتی اور محیّر العقول عناصر کا وجود ان کی تخلیقات میں واضح دکھائی دیتا ہے۔ ان کے افسانوں میں موجود ماوراالعقل و محیّر العقول جزئیات اپنے اندر ایک الگ رنگ سموئے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ محبت اور تصوف ان کے افسانوں کا بنیادی موضوع ہے۔ ان کے ہاں تصوف کی روحانی و باطنی کیفیات کا ذکر اس انداز سے ملتا ہے کہ متصوفانہ رنگ میں بھی یہ افسانے اپنے اندر مابعد الطبیعاتی، ماوراالعقل اور محیّر العقول عناصر لیے ہوئے ہیں۔

---

[i] اسکالر پی ایچ۔ ڈی، شعبہ اُردو، گورنمنٹ کالج یونی ورسٹی، لاہور۔(Corresponding Author)
[ii] ایسو سی ایٹ پروفیسر، شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج یونی ورسٹی، لاہور۔

اشفاق احمد کے افسانوی مجموعے ''طلسم ہوش افزا'' میں نہ صرف ایسے بہت سارے فوق الفطرت، محیّر العقول عناصر موجود ہیں جن کی بناپر اس مجموعے کا نام پڑھتے ہی ذہن مابعد الطبیعاتی دنیا میں داخل ہونے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ طلسم تو ہوش اُڑا دیتا ہے مگر یہ کیسا طلسم ہے جو ہوش کو راحت بخش رہا ہے۔ اشفاق احمد کے افسانوں میں حقیقی رنگوں کے ساتھ ساتھ مابعد الطبیعاتی، فوق الفطرت اور محیّر العقول عناصر بھی موجود ہیں۔ اشفاق احمد کے متعدد افسانے محیّر العقول کی ذیل میں آتے ہیں۔ خالد محمود سنجرانی لکھتے ہیں کہ۔۔۔ ''ملک مروت''، ''بولتا بندر''، ''سعید جونیئر'' اور ''پوری جان کاری'' مابعد الطبیعیاتی افسانے قرار دیے جا سکتے ہیں۔'' [۱]

اشفاق احمد کے ہاں عشق کے سچے جذبے بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں۔ یہ تصورات ان کے ہاں ایک منفرد مقام و مرتبہ پر فائز نظر آتے ہیں۔ ان کے عشق کا انداز ہوس ناکی کی بجائے محبت کے کارفرمائی جذبات والا انداز نظر آتا ہے۔ اشفاق احمد نے اپنے افسانوں میں خدا کی ذات کو تلاش کرنے کا رجحان متعارف کرایا ہے جو تصوف کا ایک اہم پہلو ہے۔ جب اشفاق احمد تصوف کی بات کرتے ہیں تو اس میں محیّر العقول عناصر جا بجا نظر آتے ہیں۔ اشفاق احمد کی متذکرہ جہت کے حوالے سے فریحہ نگہت کہتی ہیں:

> ''علم الوجود اور سچے جذبہ عشق کے پس منظر میں لکھنے والوں میں اشفاق احمد ایک بڑا نام ہے جن کے ہاں عشق کا تصور بڑا منفرد ہے۔ وہ عشق کے افلاطونی تصور کے قائل ہیں جس میں ہوس نہیں بلکہ صرف محبت کارفرما ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں خدا کی ذات کو تلاش کرنے کے رجحان کو متعارف کروایا جو ان کے ہاں تصوف کے جملہ پہلوؤں کی جانب مراجعت کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ان کی مابعد الطبیعاتی موضوعات سے خاص دلچسپی ان کے افسانوں میں واضح طور پر دکھائی دیتی ہے۔ اس ضمن میں ان کے افسانے، حقیقت نیوش، مانوس اجنبی، ایل ویرا، قصہ نل دمینتی، بیا جاناں اور گڈریا اہم جانے جاتے ہیں۔'' [۲]

اشفاق احمد کا افسانہ ''قصاص'' جس میں بظاہر ایک ایسی داستان بیان کی گئی ہے جس میں ایک گاڑی اپنے مالک کے خون کا بدلہ لیتی ہے۔ اس افسانے میں استعمال ہونے والی فنی زبان اس کی سائنس فکشن ہونے کا پتا دیتی ہے۔ مگر دوسری جانب اس افسانے میں مابعد الطبیعاتی عناصر کا اس وقت معلوم ہوتا ہے جب

وہ گاڑی خود بخود سٹارٹ ہو کر اپنے مالک کا بدلہ لیتی ہے۔ جیسا کہ اشفاق احمد ''قصاص'' میں رقم طراز ہیں :

''قاتلوں کو اتنا قریب اور اس قدر پر سکون اور ایسے گھمنڈی اور مغرور دیکھ کر لینڈ روور کی آنکھوں میں خون اتر آیا اور اس کی بتیاں ایک دم روشن ہو گئیں۔ پھر اس نے فرسٹ گیئر میں ایک سو بیس میل کی سپیڈ پر اپنے آپ کو ابھارا اور اینٹوں پر سے اچھل کر بمپر جوڑ کے گورے قاتل کو ٹکر ماری جو کچھ دیکھے، سوچے، بولے بغیر وہیں ڈھیر ہو گیا۔ دوسرے نے بھاگنے کی کوشش کی تو موٹر نے تھوڑا سا پیچھے ہٹ کر اور بائیں طرف گھوم کر بھاگتے قاتل کو زور کی ایک سائیڈ ماری اور اسے زمین پر گرا دیا۔''[۳]

ایک موٹر کار اپنے مالک کو کیسے پہچانتی ہے اور کیسے انتقامی کارروائی پر اترتی ہے؟ اس میں اشفاق صاحب نے ''آنکھوں میں خون اترنے'' کا محاورہ استعمال کیا ہے۔ بدلہ لینے کے لیے احساسات جاگنا یا دشمنوں کو قریب پا کر بدلہ لینے کی امنگ جاگنا اور آنکھوں میں خون اترنا ایک جبلی بات ہے مگر جب یہ خون ایک بے جان چیز میں اتر آئے تو بلا شبہ یہ مابعد الطبیعاتی عنصر ہے۔ جس سے انسانی عقل ورطہ حیرت میں آ جاتی ہے۔

اسی افسانے کے آخر میں جب ایک مکینک لینڈ روور کی فنی خرابی کو دیکھنے کے لیے چیک کرتا ہے تو اس وقت ایک گاڑی کے احساسات کا بیان بھی مابعد الطبیعاتی و محیر العقول لگتا ہے۔ جیسا کہ :

''مکینک کی یہ بات سن کر گاڑی بہت مسرور ہوئی اور اس کے کاربریٹر سے ہلکی سی آواز آئی ''اوئے روئیں اپنی مکینک گری کو گدھے، کبھی موٹر اس طرح سے بھی سٹارٹ ہوئی ہے۔''[۴]

یہ بات قابل تحقیق ہے کہ ایک ہندی فلم ''ٹارزن'' منظر عام پر آئی۔ اس فلم کی کہانی بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ جو کہ ایک کار کے گرد گھومتی ہے۔ یہ فلم ۲۰۰۴ء میں پردہ سکرین پر دیکھی گئی۔[۵] یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ ہندی فلم ایک انگریزی فلم Christine کا چربہ ہے کیوں کہ یہ انگریزی فلم ۱۹۸۳ء میں پردہ سکرین پر دیکھی گئی۔[۶] یہ فلم دراصل اسی سال منظر عام پر آنے والے ایک انگریزی ناول جس کا نام Christine ہی ہے سے اخذ کی گئی ہے جو کہ سٹیفن کنگ کا تخلیق کردہ ہے۔[۷] اس کا سائنس فکشن دراصل مابعد الطبیعاتی بن جاتا ہے۔ وہ بھی بالکل لینڈ روور کے قصاص کر طرح کرتی ہے۔

''قصاص'' میں جس طرح محیر العقول عناصر ایک موٹر کار کی شکل میں دیکھنے کو ملتے ہیں بعینہٖ اس

قسم کے واقعات ہماری داستان کی روایات سے بھی جڑے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ان روایتی داستانوں میں پالتو جانور مثلاً گھوڑا، کتا، پرندے اور ہاتھی وغیرہ شامل ہیں جو اپنے مالک کی خوشبو، حرکات وسکنات اور اس کی آواز کی پہچان رکھتے ہوئے اس کی آواز پر لبیک کہتے ہیں۔ اشفاق احمد کا تعلق فلم اور ڈراما سے بھی بڑا گہرا ہے۔ اس ضمن میں بہت ساری فلموں میں ایسے کردار دیکھنے کو ملتے ہیں۔ بالکل اسی طرح متذکرہ افسانہ میں بھی اشفاق احمد نے روایتی داستان کے اساطیری کرداروں سے بھی استفادہ کیا۔ گاڑی کی پر اسرار حرکات و سکنات اردو داستان میں پائے جانے والے گھوڑے یا گھوڑی کے کرداروں سے مماثل ہیں۔ اس ضمن میں ڈاکٹر انوار احمد لکھتے ہیں:

> ”قصاص میں پنجاب کے اُن لوک قصوں کے پس منظر میں نئی معاشرت کے اجزا سے ایک نئی کہانی بنائی ہے، جس میں اپنے سوار کے قاتلوں کو اب گھوڑے نہیں لینڈ روور پہچانتی ہے اور قصاص بھی لیتی ہے، نظامِ انصاف کی رسومات تب بھی وہی تھیں جو اب ہیں، سو اشفاق احمد نے تو یہ بتا دیا کہ بچارو والوں کی وارث تو یہ مہنگی گاڑی ہے، جو قصاص لے سکتی ہے۔“ [۸]

بانو قدسیہ کے ہاں مابعد الطبیعاتی عناصر ان کے افسانوں کا خاصہ بنتے ہیں۔ وہ ایک عہد ساز اور باشعور افسانہ نگار ہیں۔ وہ معاشرے کی ایک ماہر نباض کی صورت میں نظر آتی ہیں۔ بانو قدسیہ معاشرے کی ظاہری و باطنی کیفیات کو بھرپور انداز سے اپنے افسانوں میں سموتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ان کے ہاں روحانیت، اپنے ماضی سے جڑت اور ماورائے نقطہ ہائے نظر عام ملتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں بھی فوق الفطرت عناصر اپنی موجودگی کا پتا دیتے ہیں، جیسا کہ ڈاکٹر محبوب عالم ان افسانوں میں مابعد الطبیعاتی عناصر کی نشاندہی کرتے ہوئے یوں رقم طراز ہوتے ہیں:

> ”بانو قدسیہ کے افسانوں میں فکر و فن کا بہترین امتزاج نظر آتا ہے۔ ان کے افسانوں میں سماجی و معاشرتی شعور، بصیرت اور مابعدالطبیعاتی رنگ ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔“ [۹]

بانو قدسیہ کے ایسے افسانے میں جن میں فوق الفطرت، مابعد الطبیعاتی اور محیر العقول عناصر پائے جاتے ہیں، جیسا کہ افلاطون کے ہاں محبت کا جو تصور پایا جاتا ہے بالکل اس قسم کا تصور بانوں کے ہاں بھی ملتا

ہے۔ جس میں محبت کے سچے جذبات کی قدر انا کا مان نظر آتا ہے۔ محبت کے ان جذبوں میں بعض جگہ پر متصوفانہ رنگ بھی نظر آتا ہے اور عشق کا عنصر بھی بدرجہ اتم نظر آتا ہے۔ بانو قدسیہ کے ایسے بہت سے افسانے ہیں جن میں یہ رنگ بھر طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ بانو قدسیہ کے ہاں پائے جانے والے انھیں تصورات کے بارے میں فریحہ نگہت رقم طراز ہیں:

> ”بانو قدسیہ نے بھی اپنے افسانوں میں مابعد الطبیعاتی فکر کو موضوع بنایا ہے۔ وہ بھی محبت کے افلاطونی تصور کی قائل ہیں اور محبت میں سچے جذبوں کو اہمیت دیتی ہیں۔ متصوفانہ خیالات، تصوف اور عشق کا عنصر ان کے ہاں بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ بانو قدسیہ کے مابعد الطبیعاتی طرز کے افسانوں میں توجہ کی طالب، خود شناس، نیلو فر، مراجعت، بکری اور چرواہا، جھکورا، انتر ہوت اداسی، امر بیل، یہ رشتہ و پیوند، سدا کا روگ اور سامانِ شیون اہم ہیں۔“[۱۰]

بانو قدسیہ کے ہم سفر اشفاق احمد کے ہاں یہ فوق الفطرت عناصر اپنی شد و مد سے موجود ہیں۔ ان کے افسانوں میں جو محیر العقول عناصر پائے جاتے ہیں وہ کسی نہ کسی طرح سائنسی توضیحات پر مبنی نظر آتے ہیں یا ان کا رنگ قیاسی نظر آتا ہے۔ اشفاق احمد کے افسانہ ”ملک مروت“ بھی اپنے اندر مابعد الطبیعاتی عناصر لیے ہوئے ہے۔ یہ تو ہمارے ایمان کا حصہ ہے کہ فرشتوں کا وجود ہے اور وہ اپنے اپنے مقرر کردہ کاموں میں مشغول ہیں۔ ان کے اندر اللہ تعالیٰ نے ایک خاص سرشت رکھ دی ہے۔ وہ اس سرشت سے ذرہ برابر بھی نہیں ہٹ سکتے۔ اس افسانے میں ایک فرشتے کو ایسا کام کرتے ہوئے دیکھایا گیا ہے جو کہ اس کے فرائض میں نہیں ہے۔ لہٰذا یہ بھی ایک مابعد الطبیعاتی عنصر اس افسانے میں موجود ہے۔ اس افسانے میں دانیال کی گاڑی کسی ایسی جگہ پہنچ جاتی ہے جہاں کوئی جا ہی نہیں سکتا تو پھر اس کی کار پہاڑ کی چوٹی تک کیسے پہنچ گئی اور مزید یہ کہ وہاں سے کار کا نیچے اترنا اور دانیال کو خبر تک نہ ہونا یہ ساری باتیں مابعد الطبیعات سے ہی تعلق رکھتی ہیں۔ مثال ملاحظہ ہو:

> ”اس کی موٹر تیز دھوپ کے اندر پہاڑ کی ایسی چوٹی پر کھڑی تھی جس کے چاروں طرف گہری وادیاں تھیں اور اس چوٹی تک پہنچنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔“[۱۱]

ایک اور مثال یوں ہے:

"موٹر کے تھروٹل سے ایک زور کی چنگھاڑی ماری اور تینوں وادیاں ایک ساتھ گونج اٹھیں۔ پھر گاڑی تیزی کے ساتھ بیک ہوئی اور بڑی دکھی آواز میں چالیس فٹ نچان پر مکی ماؤس کی طرح بھاگتی ہوئی صاف راستے پر آکر رک گئی۔ دانیال نے آنکھیں کھول کر دیکھا ملک صاحب سٹارٹ موٹر کے پہلو میں کھڑے ہاتھ کے اشارے سے دانیال کو اپنے پاس بلا رہے تھے۔" [۱۲]

"طلسم ہوش افزا" کے مجموعے میں شامل ایک افسانہ "سونی" کے عنوان سے ہے۔ 'سونی' ایک کمپنی کا نام ہے جو الیکٹرانک کی اشیاء مثلاً، ٹی وی، ٹیپ ریکارڈر اور وی سی آر وغیرہ بناتی ہے۔ اس افسانے میں 'سونی' کے ایک وی سی آر کا تذکرہ ہے جو کہ اس کہانی کے مرکزی کردار کی ملکیت ہوتا ہے۔ اس افسانے میں بھی سونی (جو کہ ایک وی سی آر) ہے اپنے مالک (بختیار) سے باتیں کرتا ہے۔ بعض جگہوں پر ایسا محسوس ہوا ہے کہ جیسے یہ باتیں سونی کی بجائے خود بختیار کے ذہن میں تھیں۔ انھیں باتوں کو وہ خود کلامی کی شکل میں بیان کرتا ہے۔ جب کہ مصنف نے اس کو بزبان سونی بیان کیا ہے۔ جو کہ ایک مابعد الطبیعاتی چیز ہے۔ جیسا کہ اس افسانے میں ہے:

"سونی نے بڑی مدھم سرگوشی میں کہا "چلو نیچے تہ خانے میں چلیں سب تمہارا انتظار کر رہے ہوں گے۔" [۱۳]

اسی طرح جب دانیال یہ دیکھتا ہے کہ اس کا محبوب "سونی" کس طرح اس کی غیر موجودگی میں استعمال ہوتا رہا ہے اور کس طرح اس کا سوئچ قالین پر پڑا ہوا ہے۔ جس پر گرد لگی ہوئی ہے۔ تو دانیال کو اس بات کا بہت رنج ہوتا ہے کہ اس کی چیز کو کس برے انداز سے استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ پھر کس انداز سے یہ دانیال سے ہم کلام ہوتا ہے۔ مثال ملاحظہ ہو:

"ادھر دیکھو جان من۔۔۔ میری طرف۔۔۔ اپنے سونی کی طرف۔۔۔ بختیار کو اپنی آنکھوں اور اپنے کانوں پر یقین نہ آیا تو سونی نے ہنس کر کہا "محبتوں میں کنکشنوں کی ضرورت نہیں ہوتی بختیار! نہ تار کی نہ پلگ کی، نہ میل کی نہ فی میل کی۔۔۔ اس کے لیے تو بس محبوب کی ضرورت ہوتی ہے۔" [۱۴]

اقتباس کے اس حصے میں سونی کا بختیار سے مکالمہ درج ہے۔ جس میں سونی جو کہ ایک بے جان

الیکٹرانک چیز ہے اپنے مالک بختیار سے ہم کلام ہوتا ہے۔ یہ اس افسانے میں ایک ایسا عنصر ہے جو کہ مابعدالطبیعاتی کہا جاسکتا ہے۔ کیوں کہ کسی بھی بے جان چیز کا اس طرح سے بات کرنا ماورا العقل ہے۔

''طلسم ہوش افزا'' کا ایک اور اہم افسانہ ''سعید جونیئر'' ہے، جو کہ بلاشبہ مابعدالطبیعاتی افسانہ کہا جا سکتا ہے۔ اس کی وجہ اس میں وہ کردار ہے جو سعید کے سامنے آتا ہے۔ بنیادی طور پر یہ کردار اسی کے ضمیر کی آواز ہوتی ہے۔ جب سعید پر امیر ہونے کا بھوت سوار ہوتا ہے تو وہ اس مقصد کے لیے انعامی بانڈز کے نمبر حاصل کرنے کے لیے چلّے کاٹتا ہے، ورد کرتا ہے، اسی کے دوران اس کی ملاقات سعید جونیئر سے ہوتی ہے۔ جس کا قد ڈیڑھ، پونے دو فٹ ہوتا ہے اور ہونٹ سلے ہوئے ہوتے ہیں۔ مگر اس کے باوجود وہ بات بھی کرتا ہے۔ یہ ایک ایسی خواب کی سی کیفیت ہے جو کہ مابعدالطبیعاتی عنصر ہے۔ جیسا کہ اس افسانے میں بیان کیا گیا ہے:

> ''سعید نے اس اجنبی شخص کو غور سے دیکھا تو اسے وضع قطع، رنگ روپ اور شکل و صورت کے اعتبار سے بہت ہی حسین پایا۔ اس کی نشست میں شہزادوں کی پھبن اور صوفیوں کی دل ربائی تھی۔ ایک موٹی ڈکشنری سے ٹیک لگائے وہ بڑی پرسنتا کے ساتھ بیٹھا تھا اور سعید کو دیکھ رہا تھا۔ ڈیڑھ پونے دو فٹ کا انسان، ایک طرفہ وجود، چاند نگر کا باسی، اانوکھا لاڈلہ حزن وملال سے پاک، مزے سے میز پر بیٹھا تھا۔ اس کے کندھوں اور گردن اور ٹھوڑی پر مسکراہٹ کی لہریں نمایاں تھیں لیکن اس کے ہونٹ سلے ہوئے تھے۔ سعید نے ایک ہلکی سی کپکپی کے ساتھ پوچھا "تم کون ہو" تو اس نے ذرا توقف کے بعد بڑے سبھاؤ سے جواب دیا: "میں سعید جونیئر ہوں اور تمہارے ساتھ رہتا ہوں۔'' [۱۵]

اسی طرح سعید جونیئر سے مکالمے کے دوران بہت ساری ایسی باتیں ہوتیں ہیں جو کہ محیر العقول ہیں۔ جیسا کہ سعید جونیئر کا یہ کہنا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے ہاں حاضری ہوتی ہے۔ سعید جونیئر کا ٹھکانا عرشِ معلیٰ پر ہے۔ پھر سعید جونیئر کا یہ کہنا کے تمام لاٹری اور انعامی بانڈز کے نمبر اوپر کھلے پڑے ہیں۔ سعید جونیئر مزید کہتا ہے کہ جیسے ورد اور وظائف تم کر رہے ہو اس سے کہیں زیادہ مقبول ورد اور وظائف دوسرے علاقوں کے لوگ بھی کرتے ہیں جو کہ وہاں زیادہ مقبول ہیں۔

درج بالا تمام بحث سے یہ بات عیاں ہے کہ سعید جونیئر کا کردار ہی فوق الفطری ہے۔ یہ ساری

باتیں تو انسان صرف سوچ سکتا ہے ان کا مادیت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور اگر کہیں بنتا بھی ہے تو وہ بھی ایمان کی حد تک ہے۔ اس لیے اشفاق صاحب کے اس افسانے میں یہ مابعد الطبیعاتی عناصر ہیں۔

مابعد الطبیعات عناصر بانو قدسیہ کی فکر کا ایک اہم جزو معلوم ہوتے ہیں۔ بانو قدسیہ انھیں مابعد الطبیعاتی عناصر سے ایک ایسی طلسماتی فضا قائم کرتی ہیں کہ اس سے باطنی کیفیات کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہی وہ طلسماتی فضا ہے جو قاری کو بانو قدسیہ کی فکر و شعور سے آگہی کا سبب بنتی ہے۔ بانو قدسیہ کا افسانہ ''کیمیا گر'' اپنے اندر مابعد الطبیعاتی عناصر و فکر رکھتا ہے۔ اس افسانے میں بابا خیرو کا کردار جو کہ مرکزی کردار ہے تعویز گنڈے، اور جادو گروں سے بخوبی واقف ہے۔ جیسا کہ بانو قدسیہ لکھتی ہیں:

> ''وہ تو دوسری طرح کے نسخے بنوانے آتا ہے۔ جادو کے نسخے۔۔۔ گنڈے، تعویز کی چیزیں لینے آتا ہے۔ بابا خیرو۔۔۔ بابا خیرو تو جادو گر ہے۔۔۔ بڑے بڑے جن اس کے تابع ہیں۔ چاہے تو راتوں رات مولوی صاحب کی چارپائی اٹھوا کر قبرستان پہنچا دے۔ چاہے تو تمہارے قصبے میں آندھی آجائے۔''[۱۶]

توہمات پرستی اور ضعیف الاعتقادی معاشرے میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ شاید اس کی وجہ وہ روایت ہے جو ہندوستان میں قبل از مسیح سے چلی آرہی ہیں۔ لوگ ابھی تک اسی کے اسیر نظر آتے ہیں۔ بانو قدسیہ کے افسانے" کیمیا گر "میں یہی رنگ بدرجہ اتم نظر آتا ہے۔ اس افسانے میں رشید کا کردار جن نفسیاتی مسائل سے گزرتا ہے۔ وہ مسائل بھی بعد ازاں مابعد الطبیعاتی نظر آتے ہیں:

> ''رشید اپنے باپ اور مولوی صاحب کی مار پیٹ سے عاجز آچکا ہے۔ اس لیے جب وہ بابا خیرو کے متعلق اپنے ہم جماعت فقیرے سے دلچسپ باتیں سنتا ہے تو اس کا دل پڑھائی سے اچاٹ ہو جاتا ہے اور وہ تمام وقت بابا خیرو تک رسائی حاصل کرنے میں صرف کر دیتا ہے۔ دن بھر کی سعیٔ لا حاصل کے بعد جب وہ رات کو سوتا ہے تو خواب میں بھی اسے بابا خیرو کا ہی ہیولا نظر آتا ہے۔ رات بھر وہ عجیب عجیب خواب دیکھتا رہا۔ جیسے مدھم دیا جلا کر وہ غاروں میں پھرتا رہا ہو اور کوئی بڈھا لاٹھی اٹھائے اس کے تعاقب میں بھاگ رہا ہو۔ اس خواب نے کئی صورتیں اختیار کیں لیکن اس خواب کا تانا بانا قائم رہا جو اس کے دل کو گھیرے ہوئے تھا۔''[۱۷]

اشفاق احمد کا افسانہ ''کہکشاں ٹیکسی سٹینڈ'' فوق الفطرت عناصر پر مبنی اہم افسانہ ہے۔ اس افسانے میں بھی بہت سارے ایسے عناصر ہیں جو کہ مابعد الطبیعاتی ہیں۔ اس میں بھی مصنف اپنے آپ کو اس کہانی کا حصے بناتے ہیں۔ مصنف اُڑن طشتری میں سوار ہو کر خلا کی سیر کرنے کے لیے جاتا ہے۔ خلا میں موجود چیزیں جتنی بھی سنی گئی ہیں ان میں سے کچھ کا تذکرہ ملتا ہے۔ جیسا کہ بلیک ہول، چھوٹی کہکشاں ہے اور بوڑھا ستارہ وغیرہ کا ذکر ملتا ہے۔ یہ ساری چیزیں اپنا وجود بلحاظ سائنس رکھتی ہیں مگر مصنف کا یوں کسی اڑن طشتری میں بیٹھ کر جانا اور پھر خلا میں ان چیزوں کو دیکھنا یا کسی دوسری مخلوق کا زمین پر اترانا اور مصنف سے گفتگو کرنا۔ یہ سب ایسے عناصر ہیں جو کہ مابعد الطبیعیاتی ہیں۔ کیوں کہ سائنس فکشن میں ہر چیز کی توضیح موجود ہے مگر بغیر آکسیجن کے خلا میں سفر ایک فوق الفطری سی بات ہے۔

افسانہ ''پوری جان کاری'' میں ''کیرولین'' کے ضرب لگانے پر اینٹ میں سے آواز کا نکلنا مابعد الطبیعیاتی پہلو کی بہترین عکاسی ہے تاہم اس افسانے میں حیرت انگیز طور پر مابعد الطبیعیاتی حقیقتوں پر سوال ثبت کیا گیا ہے۔ ماہڑا کی ایک ایسی بستی کی دریافت ہونا جو کہ کئی صدیاں پہلے ہی سے اتنی ترقی کر چکی ہے کہ آج کے دور کی ترقی اس کے سامنے پانی بھرتی نظر آتی ہے۔ ۱۹۹۸ء میں شائع ہونے والا یہ افسانوی مجموعہ صرف ۱۷برس کے فرق سے ترقی کی جو منازل کو دکھارہا ہے، اشفاق صاحب نے بہت بڑی مستقبل کی ایک جھلک دکھائی ہے۔ ایسا ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی۔ اس میں ایسی ایسی مائیکرو چپس کا تذکرہ ملتا ہے جو عام آنکھ سے نظر ہی نہیں آتی ہیں۔ ان کو دیکھنے کے لیے مخصوص قسم کے آلات استعمال کیے جاتے ہیں۔ آج کل کے دور میں جتنی بھی ترقی ہو چکی ہے اشفاق صاحب نے اس سے آگے کی دنیا دیکھانے کی کوشش کی ہے جیسا کہ ماہڑا کی بستی کے لوگ علوم و فیوض کے لحاظ مکمل ہو چکے تھے۔ وہاں ایسا سامان دیکھا یا گیا ہے جو ہمارے دور میں کئی صدیوں کے بعد متوقع ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ اشفاق احمد ''پوری جان کاری'' میں بیان کرتے ہیں:

> ''پتہ چلا کہ یہ بستی نہ صرف اپنے عہد کی ایک ترقی یافتہ بستی تھی بلکہ آج کہ حوالے سے بھی ایک ایسی آبادی تھ یجس میں وہ تمام ساز و سامان موجود تھا جس کی ہم آج سے کوئی دو سو سال بعد اپنے شہروں میں ہونے کی توقع کرتے ہیں۔'' [۱۸]

علم کے حوالے سے یہ شہر اس حد تک ترقی یافتہ دیکھایا گیا ہے کہ ہر جگہ پر "دانش کدے" کھلے ہوئے ہیں اور ہر ایک کا تعلیم حاصل کرنا ضروری ہے۔ وہاں کے لوگ علم کی اس حد تک پہنچ چکے ہیں جس سے آگے پہنچنا ممکن نہیں ہے۔ علم کی اُن حدوں کو چھو لیا گیا ہے جس سے آگے انسان نہیں جا سکتا۔ کائنات میں کوئی راز ان سے چھپا ہوا نہیں ہے۔ جگہ جگہ پر کمپیوٹر سنٹر بنے ہیں جس کا دل چاہے وہ اپنی مرضی کے مطابق معلومات حاصل کر سکتا ہے۔ یہ بات صرف علم کی حد تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ اس میں انسانی رویوں کو بھی دیکھنے، جانچنے اور پرکھنے کے لیے کوئی مشکل نہیں ہے۔

اس افسانے میں اشفاق احمد نے اس بستی کے تنزل، تباہ و برباد ہونے کی وجہ بھی اسی ترقی کو قرار دیا ہے۔ ان کے مطابق وہ لوگ تو تمام سوالوں کے جوابات تلاش کر چکے تھے۔ اُن کے پاس سوچنے کے لیے کوئی چیز باقی نہ تھی۔ تو آہستہ آہستہ انھوں نے اس روش کو چھوڑنا شروع کر دیا جب انھوں نے اس روش کو چھوڑ کر سستی، بے علمی و بے عملی اور عیش پسندی کی روش اپنائی تو اس شہر کے لوگ آہستہ آہستہ تنزلی کا شکار ہو کر اس صفحہ ہستی سے مٹ گئے۔ جیسا کہ بیان ہے:

> "۔۔۔اُن کے پاس تحیر، تجسّس، اور کنج کاوی کے لیے کچھ بھی باقی نہیں رہا تھا اس لیے وہ گروہ در گروہ تنزل اور انحطاط کی طرف جانے لگے تھے اور انھوں نے اپنے زوال کے لیے وہی راہ اختیار کر لی تھی جو روبہ انحطاط قومیں اپنی بے علمی، بے عملی اور عیش پسندی کے زمانے میں اختیار کر لیا کرتی ہیں۔" [۱۹]

اسی طرح سے اس افسانے میں دوسرے اور بھی بہت سارے ایسے عناصر کا ذکر ہے جو کہ مابعد الطبیعاتی ہونے کی دلیل ہیں جیسا کہ وہاں کے لوگوں کے جذبات، وہاں سے ملنے والی مختلف چیزیں اور ان کی خاصیت۔ لہٰذا اس افسانے کو بلاشبہ مابعد الطبیعاتی افسانہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

بانو قدسیہ کا افسانہ جھکورا بھی اپنے اندر معونیت باوجوہ فوق الفطرت عناصر رکھتا ہے۔ اس میں پیش گوئی کرنا، غیب کی باتیں کرنا، یہ سب فوق الفطرت سی معلوم ہوتی ہیں۔ متذکرہ افسانے میں ایک شخص پیش گوئی کرتا ہے۔ کہ آج کل کی لڑکیاں انجینئر سے زیادہ ڈاکٹرز کو پسند کرتی ہیں۔ راوی ان باتوں کو سن کر کوئی توجہ نہیں دیتا لیکن جب گھر پہنچتا ہے تو اس کی منگیتر جو کہ پچھلے چار سال سے تہ شدہ نسبت کو توڑ

کر ڈاکٹر سے شادی کرنے کا فیصلہ کر چکی ہوتی ہے:

> ''میں نے صوبی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ چچا کا گھرانہ اتنا ماڈرن تو تھا کہ اس میں کوئی منصور کسی وقت داخل ہو سکتا تھا لیکن اس قدر گھٹیا نہیں تھا کہ مجھ سے بات توڑے بغیر صوبی کسی منصور کو اپنے بیڈ روم میں آنے دیتی۔ ہم نے فیصلہ کیا ہے ہم شادی کر رہے ہیں۔ میرے اندر باہر لکنت جاری ہو گئی دراصل یہ فیصلہ میں نے ابھی کیا ہے۔ ابھی پانچ منٹ پہلے۔''[۲۰]

اشفاق احمد کا مابعد الطبیعاتی افسانہ ''قلارے'' بھی ہے۔ اس کے عنوان کی وجہ دُور خلا میں ایک ستارے کی خرید ہے اور بعد میں اس ستارے کا نام قلارے رکھا گیا ہے۔ یہ دوری اتنی بیان کی گئی ہے جو کہ چاند سے پچاس لاکھ میل دور بتایا گیا۔ وہاں ایسے بہت سارے ستاروں کی خرید وفروخت جاری ہے۔ اس انداز سے افسانے کا آغاز ہوتا ہے جس میں اس کائنات کے اندر ستاروں کی ملکیت کے کاغذات تیار کیے جاتے ہیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے آج کے دور میں زمین کی ملکیت کے کاغذات کی بات کی جاتی ہے۔ جیسا کہ اس کہانی کے آغاز میں اشفاق احمد بیان کرتے ہیں:

> ''کیا آپ جانتے ہیں کہ اس وسیع و عریض کائنات میں اور سیاروں ستاروں کی حسین و جمیل دُنیا میں آپ اپنی پسند کا ایک ستارہ خرید کر اُسے اپنی مرضی کے مطابق ڈھال بھی سکتے ہیں اور اس کی لینڈ سکیپنگ کر کے وہاں اپنی مرضی کا سائن بورڈ بھی لگا سکتے ہیں۔''[۲۱]

اگر سائنس فکشن کی توضیح کو دیکھا جائے تو کسی سیارے پر تو زندگی کے کچھ آثار مل سکتے ہیں مگر کسی ستارے پر ایسا ممکن نظر نہیں آتا۔ مصنف نے یہاں ستاروں کی خرید وفروخت کی بات کی ہے جو کہ عقل تسلیم نہیں کرتی کیوں کہ ظاہری صورتِ حال کو اگر دیکھا جائے تو ستارے اتنی روشنی اور گرمی رکھتے ہیں کہ دور سے ہی وہ چیزوں کو پگھلا کے رکھ دیتے ہیں۔ ستاروں کی خرید وفروخت ایک مابعد الطبیعاتی چیز ہے۔ اس کے برعکس حقیقت میں مصنوعی سیاروں کے دائرے (Orbit) خریدے جا رہے ہیں۔

اس افسانے کا مرکزی کردار شہزاد ہے۔ شہزاد کے گرد ہی ساری کہانی گھومتی ہے۔ اس افسانے میں شہزاد اپنے ستارے تک پہنچنے کے لیے مختلف یوگا کی ورزشیں سیکھتا ہے۔ ایک خاص قسم کا آسن سیکھنے کے بعد

وہ فضا میں ایسے اڑتا ہے جیسے کوئی اُڑن کھلونا۔ جیسا کہ اس افسانے میں ہے:

"اپنے کنول آسن کے پانچویں روز شہزاد نے محسوس کیا کہ وہ زمین سے اُوپر اُٹھ رہا ہے اور کمرے میں میز کی سطح پر آگیا ہے۔ اِس سے اُوپر اُس سے اُٹھا نہ گیا اور وہ واپس زمین پر لینڈ کر گیا۔" [۲۲]

ایک اور اہم بات کا پتہ چلتا ہے کہ انسان کو زمین پر ایسے لینڈ کرایا گیا ہے جیسے وہ کوئی جہاز ہو اور ایک مخصوص رن وے پر دوڑنے کے بعد رُکا ہو۔ یہ شہزاد کی آسن سیکھنے کے بعد کی ابتدائی مشق ہے جس میں وہ تھوڑا سا اوپر اُڑتا ہے اور اس کے بعد واپس زمین پر آ ٹکتا ہے۔ وہ اپنی مشق کو اس آسن کے لیے اور بڑھاتا ہے اور دن رات یہ مشق جاری رکھنے کی وجہ سے وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ زمین سے ۱۰۰ فٹ بلندی تک اڑنے لگتا ہے۔ جیسا کہ اس افسانے میں ہے:

"بوسٹن واپس پہنچ کر اُس نے اپنی مشق جاری رکھی اور وہ رات کی تاریکی میں سطح زمین سے سو سو فٹ اور اُوپر اُٹھ کر پھرنے لگا اور سوئے ہوئے بوسٹن کی سیر کرنے لگا۔" [۲۳]

"قلارے" کا فاصلہ زمین سے ایک نوری سال کا بیان کیا گیا ہے۔ یعنی ایک سال تک مسلسل سفر میں رہنے کے بعد اس ستارے تک پہنچا جا سکتا ہے۔ اس افسانے کے کردار زمین سے قلارے تک کا یہ سفر کیسے طے کر لیتے ہیں اور کیسے ایک نئے انداز کا علم سامنے آتا ہے اور یہ علم کون عطا کرتا ہے۔ اس کے متعلق ساری تفصیل اس افسانے میں ملتی ہے۔ جیسا کہ:

"شہزاد نے رعنا (شہزاد کی منگیتر) کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھ کر حیرانی سے پوچھا
"جان من تم یہاں پہنچیں کس طرح؟ یہ تو تقریباً ایک نوری سال کا راستہ ہے۔" [۲۴]

رعنا اپنے نئے علم کے بارے میں شہزاد کو تفصیل سے بتاتی ہے کہ اُس نے یہ علم کہاں سے اور کیسے حاصل کیا۔ یعنی زمین سے اس حد تک دور محو پرواز ہونا اور "قلارے" تک پہنچنا ایک مابعدالطبیعاتی عنصر ہے۔ جیسا کہ اس افسانے میں ہے:

"رعنا نے کہا میں نے آسٹرل باڈی کا میتھیڈ تو کب کا چھوڑ دیا ہے۔ اب تو ہم ریمیا کے ذریعے یہاں پہنچتے ہیں۔ یہ مشرقی علم ہے اور بالکل فول پروف ذریعہ ہے۔ اس میں گھپلے کا اندیشہ نہیں۔ ریڈار آگے آگے چلتا ہے اور وقت اطلاع دیے جاتا ہے۔" اور علم ریمیا کس

سے سیکھا؟" شہزاد نے پوچھا۔ "فلیمنگ روڈ پر، چوک برف خانے کے پاس" رعنا نے کہا
"ایک موچی بیٹھتا ہے۔ وہ علم ریمیا کا شہنشاہ ہے۔"۔"[۲۵]

یعنی علم ریمیا ایک جدید مشرقی علم ہے جو کہ ایک موچی جانتا ہے۔ اور رعنا نے خلاء میں سفر کرنے کے لیے یہ علم اُس موچی سے سیکھا ہے۔ یہ بات اپنے اندر تحیر و حیرت کے عناصر سموئے ہوئے ہے۔

مابعد الطبیعاتی عناصر کے حوالے طلسم ہوش افزا کا ایک اہم افسانہ "بولتا بندر" ہے۔ اس افسانے کا عنوان ہی مابعد الطبیعاتی سا معلوم ہوتا ہے۔ بولتے تو بندر ہیں ہی مگر جس انداز سے یہ بندر باتیں کرتا ہے اور جس دانائی کی باتیں کرتا ہے وہ سب مابعد الطبیعاتی ہیں۔ پھر مصنف کا اپنے دو دوستوں کے ساتھ دوران سفر اس قسم کے حالات سے دو چار ہونا بڑا معنی خیز ہے۔ جیسا کہ اس افسانے میں ہے کہ جب مصنف اور اس کے دوستوں کو راستے میں ایک ایسا بندر ملتا ہے جو کہ عام انسان کی طرح قوت گویائی رکھتا ہے:

"جب یوسف ظفر نے ایک چنچل بچے کی طرح "وہ وہ" کہتے ہوئے اس کی طرف پے در پے اشارے کئے تو اس نے آزردہ ہو کر کہا "میں چمپنزی نہیں ایک سادہ بندر ہوں۔ عام بھورا بندر۔"[۲۶]

"ہورو" نامی بندر اس کے بعد گفتگو کا ایسا سلسلہ شروع کرتا ہے جو کہ اس افسانے کے آخر تک چلتا ہے۔ مصنف اور اس کے ساتھی اس گفتگو میں میں شریک ہوتے ہیں اور گہری دلچسپی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ یہ بندر تعارف سے بات شروع کرتا ہے اور آخر میں انتہائی روہانسا ہوتے ہوئے الوداع کہتا ہے۔ اس گفتگو کے دوران مشاعرے پر بات ہوتی ہے جس میں "ہورو" اپنی دلچسپی کا اظہار کرتا ہے۔ اس کے بعد یہ سلسلہ انسان کے ارتقائی منازل کا سمیٹتا ہے اور "ہورو" کا مشہور شخصیات سے ملنا بھی اس گفتگو کا حصہ ہوتا ہے۔ اس گفتگو کے دوران یہ بندر ڈارون کے نظریات کے بارے میں گفتگو کرتا ہے۔ یہ بندر اتنا وسیع اور متنوع علوم کا ماہر نظر آتا ہے کہ وہ جنگ و جدل، انگریزوں کا قابض ہونا اور اس دور کے احوال کو بہ خوبی بیان کرتا ہے۔ یہ بندر ایسی دانشمندانہ اور عالمانہ گفتگو دلائل کے ساتھ کرتا ہے کہ ایک لمحے کے لیے بھی گمان نہیں گزرتا کہ باتیں ایک بندر کی زبانی ہو رہی ہیں۔ یہ بندر حیاتیات کے بنیادی نظریات کے بارے میں اس حد تک گہرا علم رکھتا ہے کہ مصنف کے دوست اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے نظر آتے ہیں۔ یہ پورا افسانہ اسی بندر کی گفتگو کا

محور و مرکز ہے۔ یہ بندر ہی اس افسانے کا مرکزی کردار ہے۔ مذکورہ بالا ساری باتیں مابعد الطبیعیاتی و محیر العقول نظر آتی ہیں۔

مابعد الطبیعات جہات کا پھیلاؤ بانو قدسیہ کے افسانوں میں وجود اور کائنات کے تعلق کی طرح موجود ہے۔ جس میں کائنات، انسان اور اس کے وجود کے حوالے سے بہت سارے سوالات اٹھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس کے بعد بانو قدسیہ نے انھیں سوالات کے جوابات اساطیر، مذہب اور عقائد کی روشنی میں تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ بانو قدسیہ کا افسانہ ”خود شناس“ فرد کی غیرت اور تنہائی کے نقطہ نظر سے وجودی مسائل کو سامنے لاتا ہے۔ اس افسانہ میں کردار ”ابراہیم“ ایک ایسا کردار ہے جو سماج کے بنائے ہوئے قواعد و اصول کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتا۔ اسی وجہ سے وہ اقربا اور سرزمین کو خیر آباد کہہ دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہی نظر آتی ہے کہ وہ ان قواعد پر جب سمجھوتا نہیں کرپاتا تو خود کو اس دنیا سے کنارہ کرلینا ہی بہتر سمجھتا ہے۔ بانو قدسیہ نے اپنے افسانے ”خود شناس“ میں ہندی اسطورہ کا استعمال کیا ہے اور عصر حاضر کے مسائل اور الجھنوں پر اس کا اطلاق کر کے نئے معانی و مفاہیم پیدا کیے ہیں۔ رانی میناوتی اور اس کے سپوت راجہ گوپی چند میں ہندو اسطورہ کی طرف اشارہ ملتا ہے۔

”راجہ گوپی چند جو بھرتری ہری کا بھانجا بتایا جاتا ہے۔ بھرتی ہری جو راجہ بکرم جیت کا بڑا بھائی تھا۔ یہ انا کے چکر سے نکلے ہوئے مہاراجے تھے۔ ان میں مہاتما بدھ کی روح گھومتی تھی اور وہ دولت کا کرم بھوگ جو غریبی کے چکر سے بھی سخت ہوتا ہے، توڑ کر اپنے آدرش سے ہم کنار ہو گئے تھے۔“ [۲۷]

اشفاق احمد کی سائنس فکشن ”طلسم ہوش افزا“ میں شامل ایک اہم کہانی ”کوٹ ودو پاور ہاؤس“ ہے۔ سائنس فکشن کے حوالے سے ایک افسانہ جس میں اشفاق احمد کا نظریہ محبت بھی کارفرما نظر آتا ہے۔ تیسری چیز اس میں جو نظر آتی ہے وہ مابعد الطبیعات کا موجود ہونا ہے۔ جذبات و احساسات سے گندھی ایک ایسی کہانی جو کہ انسانی جذبات و احساسات کو جدید سائنسی فکر کے ساتھ جوڑتی ہے۔ اس کے جڑنے کی وجہ سے جو سائنسی تبدیلی پیدا ہوتی ہے یہ تبدیلی ایک ایسا عنصر ہے جو کہ فوق الفطری نظر آتا ہے۔ حقیقی دنیا میں ایسا ہونا ناممکن ہے کہ لوگوں کے جذبات اور تفکر سے کچھ ایسی چیز پیدا ہو جائے، جس کی بنیاد سائنسی نظریات پر ہو۔ لہٰذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ افسانہ بھی اپنے اندر مابعد الطبیعاتی عناصر رکھتا ہے۔

ISSN:2708-5724, E-ISSN:2708-5732

بانو قدسیہ کے بیشتر نمائندہ افسانوں میں انسان اور کائنات کے وجود کی اصل حقیقت کے متعلق بے شمار مابعد الطبیعاتی سوالات ابھرتے ہیں جو بعد ازاں جذباتیت میں مدغم ہوتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ نیکوں کاروں کو سب سے زیادہ مسائل اس دنیا میں کیوں درپیش ہوتے ہیں؟ یا اس کائنات کے سامنے انسان کی کیا وقعت ہے؟ اسی قسم کے مسائل سے بھرپور افسانہ ''مراجعت'' ہے۔ اس میں بھی اسی قسم کے سوالات ابھرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس افسانے کا بنیادی موضوع خدا کے وجود کو تسلیم کرنا ہے لیکن اس موضوع کی وضاحت کے دوران میں بانو قدسیہ نے متصوفانہ اور روحانی خیالات کی وضاحت کی ہے۔ بانو قدسیہ نے اس کہانی میں خدا تک پہنچنے کی داستان بیان کی ہے جو انسانی روح کے لیے باعثِ تسکین ہو جاتا ہے۔ اس افسانے کا کردار زاہد اقبال جو کہ اپنی ماں کا اکلوتا سہارا ہے۔ اس کی ماں نے اُسے بیوگی کی حالت میں اس ظالم سماج سے سفید پوشی کا بھرم رکھتے ہوئے پالا ہے لیکن شہر میں تعلیم حاصل کرنے بعد زاہد اقبال کا انتشار کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس لیے وہ ہر وقت اس کائنات کے اسرار و رموز اور خدا کے وجود سے متعلق شک و شبہات کا اظہار کرتا رہتا ہے۔

زاہد اقبال نے مشنری کالج میں تعلیم حاصل کی ہوتی ہے جہاں اسلامی عقائد اور افکار پر بالکل بھی توجہ نہیں دی جاتی اس لیے وہ لادینی ذہنیت کا مالک ہے اور شہر سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد باوجود خدا کے وجود سے منکر ہے۔ وہ کئی بار اپنی ماں کو خودکشی کا الٹی میٹم دے چکا ہے۔ اسی دوران اس کی ملاقات پروفیسر اعجاز سے ہوتی ہے جو بیالوجی کے استاد ہیں۔ پروفیسر اعجاز بھی مذہب سے دور اور بھٹکے ذہن کے مالک ہیں۔ اس لیے وہ اتنی خوشحال زندگی گزارنے کے باوجود اپنی تقدیر کے شاکی ہیں مصنفہ نے کہانی میں پروفیسر اعجاز کی گفتگو سے فلسفۂ وجودیت کی وضاحت کی ہے جو افسانے میں مابعد الطبیعیاتی یا محیر العقل رنگ پیدا کرتی ہے:

> ''میں اس زندگی کا بوجھ ایک لمحہ بھر نہیں اُٹھا سکتا جو مجھ سے میری آزادی چھینتی ہے جو چکی میں صبح شام پیستی ہے۔ میں تو ایسے خدا کو بھی نہیں مانتا جو باندھ کر زندہ رکھنا کر زندہ رکھنا چاہتا ہے انسان کو۔۔۔ میں پروفیسر اعجاز باسط بہ قائم ہوش و حواس کہتا ہوں کہ خدا نہیں ہے۔ اس کا اگر وجود ہوتا اور ہم سب اس کی مخلوق ہوتے تو اسے کسی لمحے کسی گھڑی ہم پر ترس ضرور آتا۔'' [۲۸]

مابعد الطبیعاتی، فوق الفطرت یا ماورائی عناصر کی موجودگی اردو افسانے کا آغاز سے ہی حصہ رہی۔ اردو افسانہ اپنے بہت سے رنگ و جون بدلتا رہا مگر اساطیری یا ماورا از فطرت عناصر کی موجودگی اس ارتقائی چلن میں کہیں نہ کہیں اپنا اظہار کرتی رہی۔ اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کا جہاں پر ادبی وازدواجی ساتھ رہا وہیں پر تصوف اور ماورائی عناصر کی موجودگی دونوں تخلیق کاروں کی تخلیق میں اپنا اظہار کرتی ہوئی دکھلائی دی۔

اشفاق احمد کے ہاں فوق الفطرت عناصر کی جو شکل نظر آتی ہے وہ بانو سے کچھ اس طرح سے بھی جدا ہے کہ اشفاق کے ماورائی عناصر کائناتی رنگ لیے ہوئے ہیں مثلاً اشفاق احمد کائناتی اسرار و رموز کی گتھیاں سلجھانے کے لیے ماورائی عناصر کو سائنسی توجیہات کے ساتھ پیش کرنے کی سعی کرتے ہیں جیسا کہ سیارے، ستارے اور دیگر سائنسی دریافتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے تحیراتی یا اساطری فضا قائم کرنا جبکہ بانو کے ہاں یہ عناصر اپنا اظہار مقامی توہمات کی شکل میں کرتے ہیں۔ یعنی حسن، جادو ٹونہ، اور عامل بابوں کی کرامات وغیرہ یہاں پر یہ نظر آتا ہے کہ بانو قدسیہ عام قاری کی ذہنی اپج کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اساطیری فضا قائم کرتی ہیں جبکہ اشفاق اس سطح سے ممیّز ہو کر اوپری سطح پر روحانیات کو سائنس سے جوڑے ہوئے مابعد الطبیعیات اشیاء کا جواز پیدا کرتے ہوئے دکھلائی دیتے ہیں۔ دوسرا اشفاق احمد کا فکری کینوس جہاں پر وسیع ہے وہیں پر بانو قدسیہ فکری سطح پر مقامی اساطیری یا ماورائی عناصر کی پیش کار ہیں۔

حوالہ جات:

۱۔ خالد محمود سنجرانی، ''اشفاق احمد کی سائنس فکشن''، مشمولہ مجلہ راوی، شمارہ اکتوبر ۲۰۰۵ء، لاہور: جی سی یونیورسٹی، ۷۶۔

۲۔ فریحہ نگہت، ''اردو افسانے میں مابعد الطبیعیاتی عناصر کا اجمالی جائزہ''، مشمولہ مجلہ معیار، شمارہ ۶، ۲۰۱۱ء، اسلام آباد: بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، ۵۰۸۔

۳۔ اشفاق احمد، ''قصاص''، مشمولہ طلسم ہوش افزا (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء)، ۱۴۔

۴۔ ایضاً، ۱۶۔

5. https://en.wikipedia.org/wiki/Taarzan:_The_Wonder_Car

6. https://en.wikipedia.org/wiki/Christine_(1983_film

7. https://en.wikipedia.org/wiki/Christine_(novel

۸۔ ڈاکٹر انوار احمد،اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ (ملتان: کتاب نگر، ۲۰۱۷ء)، ۲۷۴۔

۹۔ ڈاکٹر محمد عالم خان،اردو افسانے میں رومانی رجحانات (لاہور: علم و عرفان پبلشرز، ۱۹۸۸ء)، ۵۵۱۔

۱۰۔ فریحہ نگہت، "اردو افسانے میں مابعد الطبیعیاتی عناصر کا اجمالی جائزہ"، مشمولہ معیار، شمارہ ۶، ۲۰۱۱ء، اسلام آباد: بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، ۵۰۸۔

۱۱۔ اشفاق احمد، "ملک مروت"، مشمولہ طلسم ہوش افزا، ۲۴۔

۱۲۔ ایضاً، ۲۵۔

۱۳۔ ایضاً، ۳۸۔

۱۴۔ اشفاق احمد، "سونی"، مشمولہ طلسم ہوش افزا، ۳۵۔

۱۵۔ اشفاق احمد، "سعید جونئیر"، مشمولہ طلسم ہوش افزا، ۳۷۔

۱۶۔ بانو قدسیہ،ناقابلِ ذکر (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۵ء)، ۱۸۹۔

۱۷۔ ایضاً، ۱۷۷۔

۱۸۔ اشفاق احمد، "پوری جان کاری"، مشمولہ طلسم ہوش افزا، ۷۷۔

۱۹۔ بانو قدسیہ،کچھ اور نہیں (لاہور: مکتبہ اردو، ۱۹۶۳ء)، ۱۴۸۔

۲۰۔ ایضاً، ۱۴۹۔

۲۱۔ اشفاق احمد، "قلارے"، مشمولہ طلسم ہوش افزا، ۸۳۔

۲۲۔ ایضاً، ۸۹۔

۲۳۔ ایضاً، ۸۹۔

۲۴۔ ایضاً، ۹۱۔

۲۵۔ ایضاً، ۹۲۔

۲۶۔ اشفاق احمد، "بولتا بندر"، مشمولہ طلسم ہوش افزا، ۱۱۸۔

۲۷۔ بانو قدسیہ،آتش زیرِ پا (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء)، ۸۹۔

۲۸۔ بانو قدسیہ،توجہ کی طالب (لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۵ء)، ۷۵۲۔